Date of Publication: 16-02-2014

PRICE Rs. 2/-

POSTED ON 17-18 Feb. 2014
R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2012-14
Licensed to Post Without Prepayment U (C)160/2012-14

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

22-28 February 2014
Issue: 8, Vol.:73

۲۲ تا ۲۸ فروری ۲۰۱۴ء
شمارہ نمبر: ۸، جلد نمبر: ۷۳

متحدہ ہندستان بہت سوں کا سپنا تھا لیکن شاید گاندھی جی اور مولانا آزاد کی طرح کسی کا نہیں!

گاندھی جی نے کہا تھا: ''اگر کانگریس تقسیم کو تسلیم کرے گی تو وہ صرف میری لاش کو روند کر کرے گی۔ جب تک میرے جسم میں جان ہے، میں تقسیم پر کبھی راضی نہ ہوؤں گا''۔ اور مولانا آزاد نے دعویٰ کیا تھا: ''آج اگر ایک فرشتہ آسمان کی بدلیوں میں سے اتر آئے اور دہلی کے قطب مینار پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کردے کہ سوراج چوبیس گھنٹے کے اندر مل سکتا ہے بشرطیکہ ہندستان ہندو مسلم اتحاد سے دست بردار ہو جائے تو میں سوراج سے دست بردار ہو جاؤں گا، مگر اس (اتحاد) سے دست بردار نہ ہوؤں گا''۔

لیکن جیسا کہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے اور جغرافیہ بھی کہ ہندستان تقسیم ہو گیا۔

گاندھی جی سے زیادہ ہندو دھرم کی روح سے نزدیک شاید ہی کوئی رہا ہو اور مولانا آزاد کے دینی تبحر کا بھی ایک عالم معترف ہے، پھر کیا اسباب تھے کہ مذہب سے کوسوں دور اسلام کے ایک بے پروا پیرو جناح نے امام الہند کے ہاتھوں سے مسلمانوں کی قیادت چھین لی اور ہندو دھرم کے ایک رسمی معتقد سردار پٹیل نے ہندستان کے مہاتما کو اپنے فیصلے کے تابع کر لیا!

تاریخ کے بطون میں جنگ آزادی کے تین اہم کرداروں کی سیاسی زندگی کے نشیب و فراز پر نظر ڈال کر ہم نے ان ہی سوالوں کے جواب ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے اور اس میں آپ کو بھی شریک کرنا چاہتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد

مولانا آزاد کی شخصیت اور زندگی

مولانا آزاد کے یوم وفات کے موقعے پر

پہلی قسط

تقسیمِ ہند کے پس منظر میں تین اہم کردار

مولانا آزاد، سردار پٹیل اور محمد علی جناح

اسیم کاویانی (فلیٹ نمبر702، کیتن اپارٹمنٹ، بیلویدرے روڈ، مجگاؤں، ممبئی400010)
E-mail: aseemkavyani@gmail.com

ان دونوں دل فگاروں نے متحدہ ہندستان یا متحدہ قومیت کے اپنے مقصد کی ایک عقیدے کی طرح پرورش کی تھی لیکن انجام کار انھوں نے اپنے خواب کو چکنا چور ہوتے دیکھا اور اس کی کرچیاں چنتے ہوئے اس جہاں سے گزر گئے۔

سیاسی تقسیم کی اس بساط پر جناح اور پٹیل فیصلہ کن مہرے ثابت ہوئے، جو خود اس بازی کے آغاز میں اپنی destiny سے قطعی انجان تھے۔ شاطر کھلاڑی (انگریز) نے بڑی مہارت سے اس کھیل کو اپنے مطلوبہ انجام تک پہنچایا۔ تقریباً اسی لاکھ ہندوؤں اور سکھوں نے ہندستان میں بسنے کے لیے پاکستان کو تیاگا اور ساٹھ سے ستر لاکھ مسلمانوں نے ہندستان سے نکل کر 'مملکتِ خداداد' کا رخ کیا۔ تقریباً پانچ لاکھ انسان یہاں اور وہاں کے مارے گئے۔ تاریخ ہند کا ایک خوں چکاں باب ختم ہوا اور تماشا دکھا کر کھلاڑی گیا۔

... کے حالات پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، لیکن کچھ ایسے واقعات بھی ہیں جن کا تذکرہ تو ملتا ہے پر تفصیلات تاریخ کے دھندلکوں میں گم ہیں۔ مثلاً 1905 میں تقریباً اٹھارہ برس کی عمر میں ان کا شیام سندر چکرورتی اور بنگال کے دوسرے انقلابیوں سے ربط ضبط، ان کی عملی شرکت سے بمبئی اور شمالی ہند کے کئی شہروں میں خفیہ انجمنوں کا قائم ہونا، البتہ 1906-07 کے درمیان ان کی عیش کوشیوں کا 17 ماہ کا وہ دور جسے ان کی انشا نے 'فسق و فجور' سے تعبیر کیا ہے۔ 1908 میں ان کا مصر، ترکی، عراق اور فرانس کا سفر اور وہاں پر ترک اور عرب انقلابیوں سے ملاقاتیں، اپریل 1913 کے 'الہلال' میں ان کے صریر خامہ کی 'من انصاری الی اللہ' (خدا کی راہ میں کون ہیں جو میرے ساتھ ہیں!) کی پُراسرار پکار، اور پھر حزب اللہ کا اعلان اور مجبر حازی، اور 1925 میں یورپ کے سفر کے لیے ان کے پاسپورٹ کی درخواست کے ساتھ کلکتے کے نیشنل آرکائیوز میں رکھی سی آئی ڈی کی خفیہ رپورٹس میں ان کے (1921 تا 1924 کے دوران میں) پان اسلام ازم تحریک، سبھاش بوس کے انقلابی منصوبوں اور ینگ ترکس کی سرگرمیوں سے کسی نہ کسی طرح کے روابط کے انکشافات وہ سربستہ مضامین ہیں جن کے بارے میں ہم بہت کم جانتے ہیں۔

ہمارے سامنے 'الہلال' کی فائلوں میں ان کی مسلمانانِ ہند کو دین کی راہ سے قومی تحریک سے جوڑنے کی حکمت عملی اور رہنمایانِ علی گڑھ کی سرکار پرست پالیسیوں پر تند و تلخ تنقیدوں کا دفتر ضرور کھلا ہوا ہے۔ جس سے وہ ملک کے سیاسی منظر نامے پر اس طرح ابھرتے ہیں کہ روایتی رہنمائی کے بت لرزہ براندام نظر آتے ہیں۔ 'الہلال' میں انھوں نے مسلم علما کی قومی تحریک سے دوری اور سیاسی رہنمائی میں ناکامی پر انھیں جھنجوڑتے ہوئے لکھا تھا:

''... بہتر ہے کہ سرے سے اسلام ہی کو خیر باد کہہ دیا جائے۔ دنیا کو ایسے مذہب کی کیا ضرورت ہے جو صرف خطبۂ نکاح میں چند آیتیں پڑھ دینے یا بستر نزع پر سورۂ یاسین کو دہرا دینے ہی کے لیے کارآمد ہو سکتا ہے؟''

('الہلال'، 8 اکتوبر 1913، ص: 1)

اپنوں کی طرف سے قتل کی دھمکیاں اور حکومت کی طرف سے 'الہلال' کو ضبط کرنا، مولانا کا اپنی نوائے سرش کو 'البلاغ' کے پردۂ ساز پر بلند کرنا، پھر حکومت برطانیہ کا ڈیفنس آف انڈیا ریگولیشنز کے تحت بنگال سے ان کے اخراج کا اعلان اور اسی قانون کے تحت پنجاب، دہلی، یوپی اور بمبئی میں بھی ان کے داخلے کی پابندی۔ بالآخر رانچی (بہار) کے ایک دور افتادہ قصبے میں اپریل 1916 سے یکم جنوری 1920 تک کا قید و نظر بندی کا صعوبت آزما دور ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ (حکومت کی نظر میں) 'الہلال' کی شورش انگیزیاں اور اس کے معاصر 'پائنیر' کی افترا پردازیاں تو مولانا آزاد کی سزا کا معلوم و معروف سبب ہیں ہی، حکومت ان کی ماضی کی کچھ سرگرمیوں سے بھی متشکک اور خوف زدہ رہی ہوگی!

مولانا آزاد سے گاندھی جی کا پہلا رابطہ یوں ہوا تھا کہ 1908 میں مولانا کے والد کی وفات کے سانحے پر انھیں ٹرانسوال سے گاندھی جی کا تعزیتی تار ملا تھا، اگرچہ مولانا نے اس کی وجہ یہ باور کرائی ہے کہ بمبئی اور ٹرانسوال میں ان کے والد کے عقیدت مند پائے جاتے

تھے۔ لیکن ظاہر ہے کہ گاندھی جی ان میں نہ رہے ہوں گے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ وہ مولانا کی سرگرمیوں کی سن گن رکھتے ہوں!

1918 میں جب گاندھی جی چمپارن گئے تھے تو انھوں نے رانچی میں نظر بند مولانا آزاد سے ملنے کی کوشش کی تھی لیکن حکومت نے اجازت نہ دی تھی۔ آخر جنوری 1920 میں دہلی میں دونوں رہنماؤں کی پہلی ملاقات ہوئی اور ستمبر 1920 میں مولانا، گاندھی جی کی 'تحریک عدم تعاون' سے عملی طور پر وابستہ ہو گئے، اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بہت پہلے 'الہلال' میں وہ خود اس طرح کا لائحہ عمل پیش کر چکے تھے۔ دسمبر 1920 کے کانگریس کے ناگپور سیشن میں تحریک عدم تعاون کی کامیابی اور تحریک خلافت سے کانگریس کے اشتراک سے انگریزوں کے خلاف گرمائے ہوئے ماحول کا جائزہ لیا گیا اور یہیں سے ایک طرح سے 'الہلال' کے بعد مولانا کی سیاسی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ یہ دلچسپ اتفاق دیکھیے کہ کانگریس کے اسی سیشن سے جناح نے کانگریس سے اپنا تعلق توڑ لیا۔ اس موقع کو یاد کرتے ہوئے مولانا نے کبھی اپنے دل میں کہا تو ہوگا

مرا آنا تھا ظالم تری تمہید جانے کی!

اور پھر یہ سب باتیں تو سیاست کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ آزادیِ ہند کی تاریخ میں مولانا آزاد کانگریس کے سب سے کم عمر صدر بنے اور سب سے طویل مدت تک صدر رہے۔ انھوں نے کانگریس کو کیسے کیسے سیاسی بحرانوں سے نکالا۔ خود پارٹی میں پروگریسو اور نو گریسو، ترقی پسند اور قدامت پسند کا ٹکراؤ بھی کبھی کانگریس کو تقسیم کے دہانے پر لے گیا لیکن مولانا نے ہر بار کامیابی سے سب کو ساتھ لے کر چلنے کی راہ نکالی۔ ان کی معاملہ فہمی، تدبر اور متحدہ قومیت میں اٹل وشواس کی وجہ سے انھیں گاندھی جی کے بعد اہم مقام حاصل تھا۔

ملک کی آزادی اور اتحاد کی جدوجہد میں مولانا عزم و استقامت کی چٹان بنے رہے اگرچہ انگریزوں نے کوئی طرح ستم چھوڑی نہ اپنوں نے بھی تیر ملامت سے ہاتھ روکا۔ انھوں نے اپنی زندگی کی تقریباً ایک دہائی قید و بند میں گزاری۔ احمد نگر کی ان کی اسیری کے دور میں کلکتے میں ان کی بیوی اور بھوپال میں ان کی ہمشیرہ (آبرو بیگم) اپنی اپنی بیماری سے جاں بر نہ ہو سکیں۔ ان کے ساتھیوں نے فقر و فاقے میں بھی ان کے صبر و استغنا کی شہادتیں دی ہیں اور یہ رنج و انھا انھوں نے اپنے اسیری و دلگیری کے ماحول کو وطن کے لیے ہنس کر منتخب کیا تھا۔

مسلم لیگ، جس کے پالن ہار نواب اور زمیں دار تھے، زندگی بھر مولانا کی راہ میں روڑے اٹکاتی رہی۔ جب جناح نے اس کی قیادت سنبھالی تو مسلم لیگیوں نے مولانا کو سدا اتہام اور دشنام کا نشانہ بنائے رکھا۔ پنڈت سندر لال نے لکھا ہے کہ "...کبھی کبھی ان کی جان بچانے کے لیے خاص انتظام کرنے پڑتے تھے۔ ایسے موقع پر مہاتما گاندھی آہیں بھر کر یہ کہتے تھے کہ "آہ، ہمیں مولانا کے لیے یہ انتظام بھی کرنا پڑتا ہے!"'

سنگ ہیں، ناوک دشنام ہیں، رسوائی ہے
یہ ترے شہر کا انداز پذیرائی ہے

مولانا آزاد اور جواہر لال ایک دوسرے کے گہرے رفیق، مزاج داں اور قدر شناس تھے۔ مولانا نے لکھا ہے کہ نہرو ایک وسیع النظر، بااصول، روادار انسان اور ہندستان کی مشترکہ تہذیب کا پیکر تھے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے نہرو کو جذباتی، حساس اور تصور پسند بھی پایا تھا۔ مولانا کا نہرو کے متعلق جہاں یہ دلچسپ تبصرہ ملتا ہے کہ نہرو ہر مسئلے کو جس طرح دیکھتے ہیں وہ قومی سے زیادہ بین الاقوامی ہوتا ہے، وہیں پنڈت نہرو کے رجحان طبع کو دیکھتے ہوئے شائستگی سے کیا گیا یہ اشارہ بھی کہ لیڈی ماؤنٹ بیٹن ان لوگوں کی بھی ہم نوائی حاصل کر لیتی ہیں جو ان کے شوہر سے پہلے اتفاق نہیں رکھتے تھے۔

مولانا آزاد نہرو کی دو بڑی غلطیاں بھی معاف نہیں کر پائے۔ ایک تو یہ کہ 1937 کے انتخاب کے بعد یوپی کی وزارت میں لیگ کو شامل نہ کرنے کی کانگریس کی عہد شکنی وہ غلطی تھی جسے جناح نے یوپی میں فرقہ وارانہ ڈھنگ سے اچھال کر لیگ میں نئی جان ڈالنے کے لیے استعمال کیا۔ اس کے علاوہ وہ انھیں کیبنٹ مشن کی ناکامی کا ذمے دار بھی سمجھتے تھے۔

مولانا آزاد نے شملہ کانفرنس سے لے کر کرپس، لارڈ ویول، اور کیبنٹ مشن تک کی ہر گفتگو میں رہنمائی کی تھی۔ 1946 میں انھوں نے کانگریس کی صدارت چھوڑی تو اکثریت کا رخ سردار پٹیل کی طرف ہوتے ہوئے بھی انھوں نے نہرو کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا لیکن آزادی کے دس برس بعد اپنی سیاسی سرگذشت لکھواتے ہوئے انھوں نے اعتراف کیا کہ اگر انھوں نے سردار پٹیل کو اپنا جانشین مقرر کیا ہوتا تو وہ جناح کو بھی یہ موقع فراہم نہ کرتے کہ وہ تقسیم کے مطالبے کی طرف مراجعت کریں۔

اس کے علاوہ ان کی رائے میں جناح کی جارحانہ سیاست کے جواب میں گاندھی جی کا تحمل اور مفاہمت پسندی کا رویہ بھی جناح کے حوصلے بڑھانے کا سبب بنا تھا اور گاندھی جی کا اپنے آشرم کی ایک مسلم خاتون کے منہ سے جناح کے لیے 'قائد اعظم' کے الفاظ سن کر جناح کو لکھے اپنے ایک خط میں انھیں ان ہی القاب سے خطاب کرنا بھی غیر دانش مندانہ تھا۔

مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ 'پاکستان' کا نام ہی میرے حلق سے نہیں اترتا۔ کیا دنیا میں کچھ خطے پاک ہیں، کچھ ناپاک؟ مولانا کا کہنا تھا کہ تقسیم اتنے مسائل حل نہیں کرے گی جتنے کہ پیدا کرے گی۔ اور سب نے دیکھا کہ اس تقسیم نے مسلمانوں کو وہ نقصان عظیم پہنچایا کہ

کسی صورت کسی عنوان تلافی نہ ہوئی!

مغربی اور مشرقی پاکستان کی تشکیل دیکھ کر انھوں نے جو پیشین گوئی کی تھی کہ

"یہ دونوں علاقے کسی مقام پر ایک دوسرے سے متصل نہیں ہیں۔ یہاں کے باشندے مذہب کے سوا ہر لحاظ سے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ یہ کہنا عوام کو ایک بڑا فریب دینا ہے کہ صرف مذہبی یگانگت دو ایسے علاقوں کو متحد کر سکتی ہے جو جغرافیائی، معاشی، لسانی اور معاشرتی اعتبار سے ایک دوسرے سے بالکل جدا ہوں۔"

کیا ہم نے اسے صرف 25 برسوں میں بنگلا دیش کی صورت میں حقیقت بنتے نہیں دیکھ لیا! اپنی اسی تحریر میں انھوں نے اس تلخ حقیقت کا اظہار کرنے سے بھی گریز نہ کیا تھا کہ

"اس میں شک نہیں کہ اسلام نے ایک ایسے معاشرے کے قیام کی کوشش کی جو نسلی، معاشی اور سیاسی حد بندیوں سے بالاتر ہو لیکن تاریخ شاہد ہے کہ شروع کے چالیس برسوں یا زیادہ سے زیادہ پہلی صدی کو چھوڑ کر اسلام کبھی سارے مسلمان ممالک کو صرف مذہب کی بنیاد پر متحد نہ کر سکا۔"

(حیف! مولانا کی اس تحریر کے مزید 55 برسوں بعد بھی اس حقیقت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ ایم)

آزادی کے بعد عدم تحفظ کے بیچ دوؤں کی دہشت گردی اور دلّی میں مسلمانوں کی ہلاکتیں دیکھ کر مولانا نہ جانے کس قیامت سے گزرے ہوں گے! سردار پٹیل کہتے تھے کہ دونوں طرف کی اقلیتیں ایک جیسے انجام سے گزر رہی ہیں۔ بیگم انیس قدوائی نے اس دور کے حالات پر کتنی پُر معنی بات لکھی ہے: "افراد کا کردار حکومت کا کردار بن جاتا ہے اور ان کا اخلاقی زوال ملک و قوم کا زوال!"

مولانا نے اپنی زندگی ہی میں 'مملکت خداداد' میں یہاں سے زیادہ بدامنیوں اور شورش انگیزیوں کا دور دورہ دیکھا تھا اور مہاجروں کے ناگفتہ بہ حالات بھی۔ اس وقت ان کے دل حزیں میں ضرور یہ سوال آیا ہوگا:

بجرمِ عشق اگر کشتی مرا، ممنون احسانم
گناہ زاہدے بیچارہ یا رب چیست! حیرانم

اور یہاں اپنی جامع مسجد کی اکتوبر 1947 کی تقریر میں انھوں نے 'سات کروڑ انسانوں کے غول' کو مخاطب کر کے اپنے دل پُر درد کی جو داستاں سنائی تھی، اس کے بعد کہنے کے لیے کچھ باقی نہیں بچتا۔

مولانا کی نوائے سروش وادیِ صحرا کی اذان تھی، جسے کوئی گوش شنوا نہ ملا اور ان کے فکر و نظر کی روشنی لٹے مکان کا دیا تھی، جسے کوئی دیدۂ بینا نہ میسر ہوا اور اس طرح برصغیر کے مسلمانوں نے مولانا آزاد کی بجائے جناح کا ساتھ دے کر دراصل اپنی ہزار سالہ مشترکہ تہذیب کی بربادی کے اس کام کو انجام تک پہنچا دیا جسے انھوں نے 300 برس قبل داراشکوہ کی بجائے اورنگ زیب کا ساتھ دے کر شروع کیا تھا۔

حواشی:

۱. 'ہماری آزادی'، پہلا اڈیشن: 1961، ص-375
۲. خطبات آزاد
۳. 'اتحاد سے انتشار کی طرف'، از: مشیر الحسن، ص-267
۴. مضمون مشمولہ 'اردو ادب' (آزاد نمبر) 1959، ص 21
۵. 'ہماری آزادی'، ص: 298، 297
۶. ایضاً، ص: 453، 455
۷. 'آزادی کی چھاؤں میں'، ص 4
۸. 1945-46 کے انتخابات میں مسلم لیگ صرف ایک انتخابی نعرے 'پاکستان' پر ہندستانی مسلمانوں کے 90% ووٹ حاصل کر کے مرکزی اسمبلی کی تمام مسلم نشستوں پر اور سوائے صوبہ سرحد کے تمام صوبوں میں فتح مند ہوئی تھی اور اسی وقت مسلمانوں نے اپنی قسمت کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کے بعد ملک کی سالمیت کو بچانے کی کوششیں بے دلانہ تھیں۔ (ایم)

(باقی آئندہ)

شمالی آرکاٹ کے شعر و ادب کا پس منظر

ڈاکٹر جاویدہ حبیب
اکادمی آف اسلامک ریسرچ، 310 بھارتی داسن روڈ، ایس آئی ای ٹی، تینم پیٹ، چینئی-600018

تمل ناڈو کی اردو تاریخ پر ایک سے زیادہ مستقل کتابیں چھپ چکی ہیں، جن میں نصیر الدین ہاشمی کی 'مدراس میں اردو'، ڈاکٹر افضل الدین اقبال کی 'مدراس میں اردو ادب کی نشوونما' اور علیم صبا نویدی کی 'تمل ناڈو میں اردو' اور 'تمل ناڈو کے مشاہیر ادب'، ڈاکٹر راہی احمد باشاہ کی 'تمل ناڈو میں اردو کا ارتقا' قابل ذکر ہیں۔ ان مستقل کتابوں کے علاوہ بیسیوں مضامین یہاں کے شعر و ادب پر یہیں سے نکلنے والے سہ ماہی رسالہ 'نوائے ادب'، حیدرآباد کے ماہنامہ 'سب رس' اور دہلی کے ہفت روزہ 'ہماری زبان' میں چھپ چکے ہیں۔ حالیہ دور میں راہی فدائی اور علیم صبا نویدی کے بیسیوں مضامین تمل ناڈو کے علاقائی شعر و ادب پر شائع ہو چکے ہیں۔ ان مقالوں اور مطبوعہ کتابوں کی روشنی میں تمل ناڈو کی اردو ادب کی تاریخ نہ صرف بڑی حد تک سامنے آ چکی ہے بلکہ اس علاقے میں اردو زبان و ادب کے آغاز کا بھی تعین ہو چکا ہے۔

شمال میں اردو زبان کی تشکیل مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے کے بعد ہی سے ہونے لگی تھی، جس اپنی واضح شکل حضرت امیر خسرو کے زمانے میں پاتی ہے اور دہلی کے عوام اور فوجوں میں اس کی بول چال عام ہونے لگی ہے۔ اس کے فوراً بعد ملک کافور کا حملہ جنوب کے اس علاقے پر جو آج کل تمل ناڈو کے نام سے موسوم ہے اردو کو یہاں لے آتا ہے۔ لیکن یہ علاقہ بنیادی طور پر دراوڑی زبان کے خاندان سے تعلق رکھنے کی وجہ سے اس نئی زبان سے متاثر نہیں ہوتا۔ محمد بن تغلق کے دوبارہ تسلط کا اثر بھی تقریباً صفر کے برابر ہوتا ہے۔ لیکن عادل شاہی اور قطب شاہی حکومتوں کے زیر اثر آنے کے بعد حالات کچھ بدل جاتے ہیں۔ بیجاپوری کرناٹک اور حیدرآبادی کرناٹک کے تحت بالا گھاٹ اور پائین گھاٹ کے بڑے حصے ان دونوں حکومتوں کے زیر اثر آ جاتے ہیں۔

محمد بن تغلق نے جنوب میں دولت آباد کو اپنا پایہ تخت بنایا تو دہلی کی بڑی آبادی اس مقام پر منتقل ہو گئی تھی اور اس آبادی کے وسیلے سے جنوب میں اردو کے قدم جمنے لگے تھے۔ اگرچہ تغلق بہت جلد دہلی واپس ہو گیا مگر اس کی لائی ہوئی زبان جنوب میں رہ گئی۔ پھر بہمنی دور حکومت اور اس کے بعد عادل شاہی اور قطب شاہی دور حکومت میں اس کے قدم بڑی مضبوطی کے ساتھ جم گئے۔ اسی دوران یہ دکن سے مزید جنوب کی طرف سفر کرتی ہے۔

تمل ناڈو کی سرزمین پر اردو زبان کے آثار عادل شاہی اور قطب شاہی دور سے کچھ پہلے ہی نظر آنے لگے تھے۔ لیکن باقاعدہ ادبی روپ میں اردو اوائل دسویں صدی ہجری سے ملتی ہے اور اولین شاعروں اور نثر نگاروں میں شاہ سلطان ثانی کا نام ملتا ہے۔ شاہ سلطان ثانی کا تعلق شمالی آرکاٹ سے تھا۔ آپ نے نظم اور نثر دونوں میں تصانیف چھوڑی ہیں۔

حضرت شاہ سلطان ثانی کے بعد کئی نام سامنے آتے ہیں، جس میں شاہ عالم شطاری، شاہ مرتضیٰ گیانی، شاہ صادق آرکاٹی وغیرہ نے اس سلسلے کو تسلسل کے ساتھ آگے بڑھایا۔ یہ زمانہ نواب ذوالفقار خاں سے نواب سعادت اللہ خاں تک پھیلا ہوا ہے۔ نواب محمد علی خاں والا جاہ کے بعد اس ادبی سلسلے کو آگے بڑھانے والوں میں کئی اہم نام سامنے آتے ہیں جن میں ولی ویلوری، شاہ تراب ترناملی اور سید شاہ ابوالحسن قربی کا ذکر اہم ہے۔

مولانا قربی سے آرکاٹ کے علاقے میں جس کا ایک حصہ ویلور بھی ہے، اردو شاعری نئی زندگی پاتی ہے بلکہ ایسا لگتا ہے کہ اردو شعر و شاعری کا ماحول اس علاقے میں انہی کا پیدا کردہ ہے۔ قربی ویلوری کے بعد یہ روایت ان کے فرزند ذوقی ویلوری کے ہاتھ منتقل ہو جاتی ہے۔ ذوقی ویلور ہی میں رہے لیکن ان کی توجہ اردو پر کم اور فارسی پر زیادہ رہی۔ حضرت ذوقی کی اردو خدمات بھی اپنی جگہ پر بڑی وقیع اور اہم ہیں۔ انھوں نے عوام کی تعلیم اور اصلاح کے لیے دکنی زبان ہی کو اپنایا جو عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ باقر آگاہ کی زندگی کا ابتدائی حصہ ویلور ہی میں گزرا اور وہ قربی سے فیض پاتے رہے۔ آگے چل کر کچھ مدت تک انھیں ترچناپلی میں بھی قیام کرنا پڑا اور جب ان کی شاعری کے شباب کا زمانہ آیا تو وہ مدراس منتقل ہو گئے۔ اگرچہ وہ آخر زمانے تک مدراس ہی میں رہے، لیکن ان کی شاعرانہ صلاحیت اور تحصیل فن سرزمین ویلور شمالی آرکاٹ کی دین ہے اس لیے ان کو ویلوری کہلانا حق بجانب ہے۔ ولی ویلوری کی طرح باقر آگاہ نے بھی مثنوی کو ہی قابل توجہ سمجھا۔ مثنوی ان کے ہاں اپنے دامن کو وسیع کر لیتی ہے۔ ان کے ہاں مثنوی کے موضوعات میں مذہبی شخصیات سے لے کر عشقیہ داستانوں تک شامل ہیں۔ غزل کو انھوں نے وہ مرتبہ نہیں دیا جو مثنوی کو دیا لیکن اس صنف میں بھی ایک دیوان چھوڑا ہے۔ حضرت قربی نے اردو نثر میں بھی اپنا الگ مقام بنایا ہے جس کا اعتراف اکثر ناقدین ادب نے کیا ہے۔

حضرت شاہ تراب چشتی اسی دور کے شاعر ہیں جن کی پیدائش ضلع شمالی آرکاٹ ہی کے ایک اور شہر ترناملی میں ہوئی۔ ان کی کئی تصانیف ہیں، جن میں 'من سمجھاون' بہت مشہور و مقبول ہوئی۔ تصوف اور فلسفہ ان کے کلام میں رچا ہوا ہے۔ ان کا دور نواب محمد علی خاں والا جاہی کا عہد حکومت تھا، جو شعر و ادب کی ترقی و ترویج اور شاہی سرپرستی کے لیے مشہور ہے۔ ان کے بعد نواب عمدۃ الامرا کا مختصر زمانہ بھی شعر و ادب کی سرپرستی سے محروم نہیں رہا۔ ان کے جانشین نواب عظیم الدولہ کا عہد قدرے طویل یعنی تقریباً بیس برسوں پر محیط ہے۔ یہی وہ دور تھا جس میں باقر آگاہ، قوتی آرکاٹی، غلام محی الدین معجز اور حکیم عثمان خاں سروری شاعری کے چرچے سنائی دیتے ہیں۔ باقر آگاہ کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ قوتی آرکاٹی کی تصانیف میں 'قصص الانبیا' عرف 'ریاض مسلوا' بہت مشہور مثنوی ہے۔ معجز جو مدراس کے استاد شاعر گزرے ہیں آرکاٹ ہی میں پیدا ہوئے تھے اور آرکاٹ ہی میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ نواب امیر الامرا کی دعوت پر مدراس آئے تو یہیں کے ہو رہے۔ باقر آگاہ سے شرف تلمذ تھا۔ ان کا ایک دیوان اردو میں موجود ہے۔

اگلے دور میں دو نام ایسے نظر آتے ہیں، جن کے ذکر کے بغیر تمل ناڈو میں اردو ادب کی تاریخ نامکمل رہے گی۔ یہ نام ہیں محمد غوث شرف الملک اور مستقیم جنگ نامی۔ شرف الملک نے نثر کو اپنے قلم کا میدان بنایا اور ترجمہ 'ہدایہ' ان کی مشہور تصنیف ہے۔ مستقیم جنگ لقب تھا اعز الدین کا۔ اعز الدین بھی نامی تخلص کرتے تھے اور بھی مستقیم۔ اگرچہ ان کا خاندان گوپا منو کا تھا لیکن نامی مدراس میں پیدا ہوئے تھے اور باقر آگاہ سے شاگردی حاصل کی تھی۔ ان کی اردو مثنویوں میں 'نو بہار عشق' اور 'بہارستان عشق' بہت مشہور ہیں۔

یہاں یہ بات صاف کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شمالی آرکاٹ کی ادبی تاریخ لکھتے وقت اس کو مدراس یا تمل ناڈو کے دوسرے ضلعوں سے الگ رکھنا مشکل ہے کیوں کہ تمل ناڈو کا صوبہ ایک مکمل اکائی ہے۔ شہر مدراس یا آرکاٹ یا ترچناپلی وغیرہ شہر یا اضلاع اس کے حصے ہیں اور ایک شہر یا ضلع کے شاعر و ادیب حسب ضرورت دوسرے شہر یا ضلع میں متواتر منتقل ہوتے رہے ہیں ایسے میں بھی شہر مدراس کے شعرا آرکاٹ میں منتقل ہوتے اور آرکاٹ کے شعرا مدراس میں منتقل ہوتے ہوئے ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ اردو کی ترقی و ترویج کے سلسلے میں شہروں یا ضلعوں کو الگ الگ اکائی کے طور پر برتنے سے اپنی سالم شکل میں سامنے آ نہیں سکتے، اس لیے یہاں ایک صوبے کو بطور اکائی لیا جائے گا۔

مدراس میں مولوی محمد غوث شرف الملک کا خاندان آگے چل کر اردو کی خدمت میں بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ باقر آگاہ نے جس تاریخ کی بنیاد رکھی تھی کہ آج عربی و فارسی سے زیادہ اردو میں کتابیں تصنیف کرنے کی ضرورت ہے، اسے شرف الملک کے فرزند مولوی صبغۃ اللہ اور قاضی بدر الدولہ نے آگے بڑھایا اور نہ صرف اردو میں متعدد کتابیں لکھیں بلکہ اہم عربی و فارسی کتابوں کا آسان اردو میں ترجمہ بھی کیا۔ اسی خاندان کے جو دوسرے صاحب قلم حضرات گزرے ہیں ان میں مولوی عبدالقادر، شمس العلما قاضی عبیداللہ کا ذکر ضروری ہے۔ اس خاندان میں غلام محی الدین معجز آرکاٹی کے علاوہ جتنے بھی اہل قلم گزرے ہیں نثر کے مرد میدان تھے اور اس خاندان کی خدمات قرآنیات، علم حدیث، سیرت، علم کلام اور فقہ جیسے موضوعات پر نہایت وقیع رہی ہیں۔

لطیف آرکاٹی غالب کے ہم عصر اور آرکاٹ کے قابل قدر شاعر تھے۔ ان کا دیوان ان کی موت کے بہت بعد شائع ہوا۔ ان کے کلام کو دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شمال کی منجھی ہوئی زبان کا اثر بڑی تیزی کے ساتھ دکنی پر ہونے لگا تھا۔ لطیف آرکاٹی کے کلام کی منجھی ہوئی اور دکنی اثرات سے پاک زبان اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

(بقیہ صفحہ ۶ پر)

اردو دُنیا

اردو مترجمین کے وفد کی رام سنگھ یادو سے ملاقات

مظفر نگر (۲۹ جنوری)۔ اترپردیش اردو انوواد ک رامپیہ کرمچاری سنگھ کے ایک وفد نے اردو مترجمین کی تنخواہ سے متعلق مسائل کو لے کر تنظیم کے ریاستی انچارج شفیق الرحمن صدیقی کی صدارت میں اور آشو ملک کی قیادت میں سماج وادی پارٹی کے صدر اور سابق وزیر اعلیٰ ملائم سنگھ یادو سے آج ان کی رہائش گاہ پر ملاقات کی اور وفد نے میمورنڈم انھیں دیا۔ بعد ازاں ملائم سنگھ یادو نے کہا کہ اردو مترجمین کی تمام پریشانیاں میری جانکاری میں ہیں جلد ہی انھیں حل کرایا جائے گا۔ وفد میں صابر علی، ذاکر حسین، بلال احمد اور نسیم احمد عثمانی وغیرہ شامل تھے۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

اردو معلمین کی تقرری کا مطالبہ

باپوڑ (۳ فروری)۔ ضلع تعلیم و تربیت ادارے کی کارگزار پرنسپل اور انتخاب کمیٹی کی صدر نشا استھانا کو اردو معلمین امیدواروں نے مکتوب لکھ کر تقرری دلائے جانے کا مطالبہ کیا۔ انھوں نے اس سلسلے میں ضلع بیسک تعلیم افسر کو بھی عرض داشت پیش کی۔ اردو معلمین امیدوار معین الدین، عذرا پروین، عتیق، فیروز احمد صدیقی اور نسیم زہرا نے انتخاب کمیٹی کی صدر نشا استھانا کے نام عرض داشت میں کہا ہے کہ باپوڑ میں معاون اساتذہ عہدوں کے لیے ۱۸ اور ۱۹ دسمبر کو تیسرے مرحلے کی کاؤنسلنگ کی گئی تھی جس میں پاس ہونے والے امیدواروں کی فہرست ۹ جنوری کو بی ایس اے دفتر پر چسپاں بھی کر دی گئی تھی۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

ہیں، ضرورت ہے کہ انھیں پُر کیا جائے۔ انھوں نے مزید کہا کہ استاد، کارکنان اور طالب علم کا مثبت سنجیدگی سے اپنے مستقبل کو سنوارنے میں لگ جائے تو پھر کوئی انھیں پیچھے نہیں کر سکے گا۔

یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ تعلیمی رہنمائی کے میدان میں خواتین کافی آگے آئی ہیں، ان میں آگے آنے کا احساس قابل ستائش ہے۔ اس موقعے پر نظام نسیم کے ہاتھوں اردو اکادمی کی جانب سے طالب علموں میں وظیفے تقسیم کیے گئے۔

(آبشار، کلکتہ)

اردو میڈیم طلبہ کو نصابی کتابیں وقت پر فراہم کی جائیں

نئی دہلی (۹ فروری)۔ جناب محمد مسیح الدین مصباحی نے کہا کہ آج ہندستان کے 90 فیصد سے زائد علاقوں میں اردو زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے لیکن پھر بھی اس زبان کو اس کا حق نہیں مل پایا ہے۔ انھوں نے کہا کہ دہلی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ تو دے دیا گیا لیکن میونسپل کارپوریشن یا پھر دہلی سرکار کے اسکولوں میں بچوں کو نصاب کی کتابیں وقت پر مہیا نہیں کرائی جا رہی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ طلبہ و طالبات سالوں سے اس مسئلے سے دوچار ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ آئندہ سیشن میں دہلی سرکار اور کارپوریشن کو اپنے اپنے اسکولوں میں وقت پر نصابی کتابیں مہیا کرانے کے انتظام کرنے چاہئیں۔ سنگم وہار میں گزشتہ دنوں منعقدہ میٹنگ میں شاہ محمد قادری، یونس قادری، ہیثم اشرفی اور سلطان احمد وغیرہ نے بھی اسکولوں میں اردو طلبہ کو نصابی کتابوں کے علاوہ دیگر بنیادی سہولتیں مہیا کرائے جانے پر متعلقہ افسروں اور سرکار کی سرزنش کی تھی۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

غالب انسٹی ٹیوٹ میں ثروت خان کی کتاب پر مذاکرہ

نئی دہلی (پریس ریلیز)۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام شام شہریاراں کے موقع پر معروف افسانہ نگار ڈاکٹر ثروت خان کی کتاب 'شورش فکر' پر ایک مذاکرے کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر صادق الرحمن قدوائی نے ڈاکٹر ثروت خان کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس کتاب میں جتنے بھی مضامین ہیں ان میں انھوں نے نئے معنی کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے خصوصاً خواتین کے مسائل پر بڑی سنجیدگی سے انھوں نے گفتگو کی ہے۔ اس موقعے پر پروفیسر عتیق اللہ نے ثروت خان کی کتاب کے چند نکات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ثروت کی اچھی تنقید کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ ایک بہترین تخلیق کار ہیں۔ ان کا ناول 'اندھیرا پگ' ان کی تخلیقی کاوشوں کا ایک شاہکار نمونہ ہے اور موجودہ کتاب 'شورش فکر' ان کی عمدہ تنقید کی خوب صورت مثال ہے۔ مذاکرے کے مہمان خصوصی پروفیسر شریف حسین قاسمی نے کہا کہ اس کتاب میں غالب کی فارسی شاعری پر جو گفتگو کی گئی ہے اُسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اردو کے ساتھ ساتھ فارسی ادب پر بھی ان کی نظر ہے۔ اختر شیرانی پر لکھا ہوا ان کا مضمون بھی نئی جہتوں کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ ڈاکٹر نگار عظیم نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ ثروت خان کی اس کتاب میں زیادہ تر مضامین تنقیدی ہیں چونکہ وہ ایک اچھی تخلیق کار ہیں لہٰذا انھوں نے اپنے تنقیدی مضامین میں بھی اہم تخلیقی گوشے پیدا کیے ہیں جس سے اس کتاب کی انفرادیت میں اضافہ ہوا ہے۔ ڈاکٹر مرزا شفیق حسین شفق نے کہا کہ ثروت خان ہماری اُن تخلیق کاروں میں ہیں جنھوں نے ادبی دنیا کو پچھلے دس برسوں میں 5 اہم کتابیں دیں اور یہ تمام کتابیں علمی و ادبی دنیا میں اہمیت کی حامل ہیں۔ جناب پیغام آفاقی نے کہا کہ ثروت کی اس کتاب کی خاص بات جو قاری کو متوجہ کرتی ہے وہ اُن کے دلائل ہیں۔ وہ اپنی باتوں کو مضبوط دلائل کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ ثروت خان نے راجستھان کے کلچر کو جس خوبی کے ساتھ پیش کیا وہ انھی کا حصہ ہے اس لئے کہ وہ خود راجستھان کی تہذیب سے وابستہ ہیں۔ ڈاکٹر مولیٰ بخش نے کہا کہ ثروت خان بنیادی طور پر ایک تخلیق کار ہیں مگر ان کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے تنقیدی مضامین میں بھی بڑی مضبوطی کے ساتھ اپنے نقطہ نظر کو پیش کرتی ہیں۔ اس کتاب میں عورتوں کی حریت کے مسئلے کو انھوں نے بڑی بے باکی اور جرأت مندی کے ساتھ اٹھایا ہے۔ جلسے کی نظامت کرتے ہوئے غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر رضا حیدر نے کہا کہ اس کتاب میں دو مضامین جو غالب اور انیس پر لکھے گئے ہیں اُن میں ثروت خان نے انیس کی شاعری میں انسانی رشتوں کی عظمتوں کو جس انداز میں پیش کیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ ڈاکٹر ثروت خان نے خود اپنی تخلیق کے بارے میں مختصراً کہا کہ خواتین کو قلم مردوں کے قلم کی برابری کرنے کے لیے نہیں اٹھتا بلکہ عورت کا فکری نظام تو انسان کا انسان کے ساتھ غیر منصفانہ سلوک اور استحصال کے خلاف احتجاج کرتا ہے۔ یہ استحصال چاہے مرد کا ہو یا عورت کا، ملک کا ہو یا قدرت کا، زمین کا ہو یا فضا کا استحصال کرنے والے سے سوال بھی کرتا ہے اور جواب بھی مانگتا ہے۔ آخر میں جناب شاہد ماہلی نے تمام سامعین اور ثروت خان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں امید ہے کہ ثروت خان کی یہ کتاب بھی علمی و ادبی حلقوں میں کافی مقبول ہوگی۔

ترلوک پوری میں اردو میڈیم اسکول کا سنگِ بنیاد

نئی دہلی (۱۷ فروری)۔ ای ڈی ایم سی میئر رام نارائن دوبے اور وارڈ کونسلر کمل بجلی والی نے ترلوک پوری میں منعقد ایک پروگرام کے دوران کارپوریشن پرائمری اردو اسکول اور وارڈ دفتر عمارت کا سنگ بنیاد رکھا۔ اردو اسکول عمارت کی تعمیر ایک کروڑ 84 لاکھ روپے اور وارڈ دفتر کمپلیکس عمارت کی تعمیر ایک کروڑ 97 لاکھ 58 ہزار روپے کی لاگت سے آئندہ چودہ ماہ میں مکمل کر دی جائے گی۔ اسکول عمارت میں کمپیوٹر اور سائنس لیب کے علاوہ لائبریری بھی بنائی جائے گی۔ اس موقعے پر ای ڈی ایم سی کے افسران کے علاوہ علاقے کی معزز و سرکردہ شخصیات بھی موجود تھیں۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

اردو اسکولوں میں خالی اسامیاں پُر کی جائیں

کولکاتا (۳۰ جنوری)۔ آج مغربی بنگال اردو اکادمی کے ساتویں کل ہند کتاب میلے کا آٹھواں دن ہے۔ اردو اکادمی نے بی اے فرسٹ ایئر و سیکنڈ ایئر اور ایم اے فرسٹ و سیکنڈ ایئر کے 195 طلبہ و طالبات میں وظائف تقسیم کیے۔ اس موقعے پر مہمان خاص نظام نسیم (سابق آئی پی ایس) نے کہا کہ جب بھی تعلیم، زبان اور اردو کی بات ہوگی، وہاں آپ مجھے موجود پائیں گے۔ انھوں نے بچے بچیوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے ساتھ ساتھ کہا کہ اردو والوں کی تعلیمی کمزوری کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہمارے اسکولوں میں ایس ٹی اور ایس سی کے نام پر کافی اسامیاں خالی پڑی

اردو مترجمین کی خالی اسامیوں کو پُر کیا جائے

اعظم گڑھ (۲۳ جنوری)۔ انتخابات کے دوران سماج وادی پارٹی کی جانب سے اردو زبان کے بارے میں کئی خوش کن وعدے کیے گئے تھے جو ابھی تک وفا نہیں ہوئے۔ یہ باتیں اردو ٹرانسلیٹر ایسوسی ایشن کے ضلع صدر رضوان احمد نے کہیں۔ وہ کنور سنگھ پارک میں ماہانہ میٹنگ سے خطاب کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ جو لوگ اردو مترجم کی حیثیت سے دفاتر میں کام کر رہے ہیں ان کی حالت قابل رحم ہو چکی ہے، ایسے میں ہمارا مطالبہ ہے کہ جو باقاعدہ اردو مترجم ہیں ان کی تنخواہوں کی ادائیگی کی جائے اور اردو مترجم کے خالی عہدوں کو پُر کیا جائے۔ ایسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری شہاب احمد خاں نے کہا کہ آزادی کے بعد سے اب تک اردو کے ساتھ سوتیلا سلوک ہوتا رہا ہے جو ابھی تک جاری ہے۔ نائب صدر رنجر شاہد نے کہا کہ اردو مترجمین کو پریشان نہ کیا جائے ورنہ عوامی تحریک چلانے پر ایسوسی ایشن مجبور ہوگی۔ میٹنگ میں سید شمر مہدی، امتیاز احمد، شکیل احمد، اکرام احمد، خورشید احمد، محمد حیدر، محمد مطیع اللہ، محمد سعد اللہ، وفادار حسین، اخلاق احمد، فیضان احمد خاں، شبیر احمد خاں، انیس الرحمن اور عمران احمد وغیرہ نے لوگوں سے اپیل کی کہ وہ اپنی درخواستیں اردو زبان میں ارسال کریں۔

اس موقعے پر کثیر تعداد میں ممبران موجود تھے۔ میٹنگ کی صدارت رضوان احمد اور نظامت سید شمر مہدی نے کی۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

اردو کے صرف تین اساتذہ کی تقرری

بھاگلپور (۷ فروری)۔ محکمۂ تعلیم کی جانب سے ضلع پرائمری سیکنڈری ٹیچر تقرری ۲۰۱۲ء کے سلسلے میں ضلع اسکول احاطے میں امیدواروں کی بھیڑ لگی رہی۔ لوگ اپنی فہرست کے انتظار میں ادھر ادھر گھومتے رہے۔ اس میں موضوع اور زمرہ وار انتخاب کیا گیا۔ ہندی کے 25، اردو کے 3، سنسکرت کے 32، انگریزی کے 36، حساب کے 34، سائنس کے 30، سماجی علوم کے 38 اور فزیکل ایجوکیشن کے ۴ امیدواروں کا انتخاب کیا گیا۔ جسے کو تقرری لیٹر لینے کے لیے ضلع اسکول میں امیدواروں کی اچھی خاصی بھیڑ لگی رہی۔ واضح رہے کہ حکومت کیمپ لگا کر مرحلہ وار موضوع کے اعتبار سے اساتذہ کو تقرری کا لیٹر محکمۂ تعلیم کے ذریعے تقسیم کرا رہی ہے۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

اردو میڈیم اسکولوں کے طلبہ نصابی کتابوں سے اب تک محروم

کلکتہ (۵ فروری)۔ رواں تعلیمی سال میں اردو میڈیم اسکولوں کے طلبہ اور اساتذۂ کرام نصابی کتابوں کی عدم دستیابی کی وجہ سے جس ذہنی پریشانی اور تکلیف میں مبتلا ہیں، اس سے ہر کوئی واقف ہے۔ یہی معاملہ سال گزشتہ بھی تھا۔ ریاست کے تمام بنگلہ میڈیم اسکول (جو حکومت سے منظور شدہ ہیں) کو دسمبر ۲۰۱۲ء کے اواخر میں ہی تمام کتابیں موصول ہوچکی ہیں اور بنگلہ میڈیم والوں نے ۲ جنوری ۲۰۱۳ء کو حکومت کی ہدایت کے مطابق 'بک ڈے' بھی منا لیا اور ۳ جنوری سے ان کے ہاں باضابطہ طور سے تعلیمی سیشن کا آغاز بھی ہوگیا۔ لیکن شومیٔ قسمت کہ اردو میڈیم والوں کو اب تک کتابیں موصول نہیں ہوئی ہیں جب کہ تعلیمی سیشن کا ایک مہینہ یوں ہی گزر گیا۔ اس ضمن میں جب بھی بورڈ سے رابطہ قائم کیا جاتا ہے تو ایک ہی جواب ملتا ہے کہ ابھی کتابیں چھپ رہی ہیں۔ یہ کیسا انصاف ہے کہ بنگلہ میڈیم والوں کو قبل از وقت ہی تمام نصابی کتابیں دستیاب ہوگئیں اور اردو میڈیم والوں کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا گیا ہے۔

(اخبار مشرق۔ کلکتہ)

ڈائرکٹر اردو کو با اختیار بنانے کی تجویز کو وزیر اعلا کی منظوری

پٹنہ (۹ فروری)۔ بہار کی دوسری سرکاری زبان اردو کے عملی نفاذ کو یقینی بنانے کے لیے قائم کیے گئے اردو ڈائرکٹوریٹ کے سربراہ کو مالی و انتظامی اختیارات سونپے جانے کی راہ ہموار ہوگئی ہے۔ سی ایم سکریٹریٹ کے ذرائع کے مطابق وزیر اعلا نتیش کمار نے اس تجویز کو اپنی منظوری فراہم کردی ہے اور اس سلسلے میں نوٹیفکیشن جلد ہی جاری کردیے جانے کا امکان ہے۔ یہ معاملہ ۱۹۹۵ء میں اردو ڈائرکٹوریٹ کے قیام کے بعد سے ہی زیر التوا تھا اور اس میں نتیجہ خیز موڑ روزنامہ 'انقلاب' کی نشان دہی اور وزیر اعلا کی ذاتی دل چسپی کے نتیجے میں آیا ہے۔

اس معاملے کا حیرت انگیز پہلو یہ ہے کہ ریاست میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ تو ۱۹۸۱ء میں راج بھاشا ترمیمی ایکٹ کے ذریعے دے دیا گیا مگر اس کے عملی نفاذ کی کوئی سنجیدہ پہل تقریباً پندرہ سال تک نہیں کی گئی۔ ۱۹۹۵ء میں اس مقصد کے حصول کے لیے اردو ڈائرکٹوریٹ کا قیام عمل میں لایا بھی گیا تو اسے اس لائق ہی نہیں بنایا گیا کہ وہ اردو کو انصاف دلا سکے۔ ۱۸ اکتوبر ۲۰۰۹ء کو پہلی بار وزیر اعلا نتیش کمار نے اردو ڈائرکٹوریٹ کے زیر اہتمام پٹنہ میں منعقد قومی یکجہتی سیمینار میں اردو ڈائرکٹوریٹ کے سربراہ کو مالی اور انتظامی اختیارات سونپنے کی واضح ہدایت جاری کی، مگر ڈائرکٹوریٹ کے ہی کچھ مفاد پرست عناصر کی مفاد پرستی کے نتیجے میں یہ معاملہ کئی برسوں تک دبا رہ گیا اور اس میں کوئی پیش رفت نہیں ہوسکی، حالاں کہ اس دوران اردو تنظیموں کی طرف سے وزیر اعلا کے اعلان پر عمل درآمد کا مطالبہ وقتاً فوقتاً کیا جاتا رہا، جس کی بازگشت وزیر اعلا کے دفتر میں بھی گونجتی رہی۔ اور اسی کا نتیجہ تھا کہ ۲۷ جنوری ۲۰۱۳ء کو جب محکمۂ راج بھاشا کی ایک فائل وزیر اعلا کے سامنے گئی تو گرچہ وہ فائل اس سلسلے کی نہیں تھی، وزیر اعلا نے اس پر یہ سوال لکھ کر لوٹا دیا کہ ڈائرکٹر اردو کو ایچ او ڈی کے اختیارات دینے کے معاملے میں تاخیر کیوں ہورہی ہے؟ وزیر اعلا کے اس غیر متوقع ردعمل سے محکمے میں وقتی طور پر تو ہلچل مچی مگر ایک بار پھر محکمے کے کچھ مفاد پرست عناصر نے اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے اس فائل کو دبا دینا ہی بہتر سمجھا۔ یہ معاملہ عوام کی نظر میں بھی نہیں آسکا اندر کی بات اندر ہی دب کر رہ گئی۔ اس کے ٹھیک ایک سال بعد یعنی ۲۷ جنوری ۲۰۱۳ء کو روزنامہ 'انقلاب' کا بہار میں ورود مسعود ہوا اور پھر سلسلہ شروع ہوا اردو کے ساتھ ناانصافی کے خلاف سنجیدہ احتجاج کا۔ انقلاب میں ایک کے بعد ایک کئی چشم کشا اور انکشافاتی تحریریں شائع ہوئیں۔ اس بیچ نہ صرف اردو کو انصاف دلانے کے لیے عوامی اردو نفاذ کمیٹی کے چیف کنوینر اور صحافی اشرف استھانوی کی طرف سے پٹنہ ہائی کورٹ میں پی آئی ایل (سی ڈبلیو جے سی ۱۳/ ۲۰۱۳/ ۲۵۳) دائر کی گئی بلکہ وزیر اعلا کے استفسار والی فائل کا حشر جاننے کے لیے آر ٹی آئی کا بھی سہارا لیا گیا۔

(انقلاب۔ دہلی)

اک دیا اور بجھا

قومی اقلیتی کمیشن کے سابق چیئرمین، متعدد ریاستوں کے سابق گورنر اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق چانسلر جناب سید مظفر حسین برنی کا ۷ فروری ۲۰۱۳ء کی رات نئی دہلی میں واقع ان کی رہائش گاہ پر انتقال ہوگیا۔ تدفین پنج پیراں قبرستان میں عمل میں آئی۔ ان کی عمر 90 برس تھی۔ مظفر حسین برنی صاحب ناگالینڈ، تری پورہ اور منی پور کے گورنر کے علاوہ ہماچل پردیش اور ہریانہ کے گورنر کی ذمہ داریاں بھی نبھا چکے ہیں۔ جب وہ ہریانہ کے گورنر تھے تو اس وقت ہریانہ میں اردو کی ترقی اور فروغ کے کئی اہم اقدام کیے گئے تھے۔ وہ ۱۹۸۸ء سے ۱۹۹۲ء کے درمیان چوتھے اور پانچویں قومی اقلیتی کمیشن کے چیئرمین بنائے گئے اور ۱۹۹۰ء سے ۱۹۹۵ء کے درمیان جامعہ ملیہ اسلامیہ کے چانسلر کے عہدے پر فائز رہے۔ انھوں نے اقبال پر کئی اہم کتابیں تصنیف و تالیف کیں۔ انھوں نے غیر معمولی محنت اور دیدہ ریزی سے علامہ اقبال کے خطوط تلاش کرکے چار جلدوں میں 'کلیاتِ مکاتیبِ اقبال' کے نام سے طویل مقدمے کے ساتھ شائع کیا جن کی برصغیر ہند و پاک میں بہت پذیرائی ہوئی۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

○

دہلی کے بزرگ و معروف شاعر جناب محمد ادریس شاہ خدائی دہلوی کا ۱۰ فروری ۲۰۱۳ء کی شب میں طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ وہ کافی عرصے سے سانس کے مرض میں مبتلا تھے۔ ۱۱ فروری کو ان کی نماز جنازہ بعد نماز ظہر درگاہ فیض الٰہی میں ادا کی گئی اور تدفین قبرستان دہلی گیٹ میں عمل میں آئی۔ مرحوم کے پس ماندگان میں سات بیٹے شامل ہیں۔ ان کی پیدائش ۱۹۲۵ء میں دہلی میں ہوئی تھی۔ انھیں بچپن سے ہی شاعری کا شوق تھا۔ انھوں نے 16 سال کی عمر میں پہلا مشاعرہ پڑھا، اس کے بعد انھوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ ان کے کئی شعری مجموعے 'آواز کی لکیریں' اور 'شعلۂ جاں' وغیرہ منظر عام پر آئے اور ایک دیوان بھی شائع ہوا۔ ان کی ادبی و شعری خدمات کے اعتراف میں انھیں بہت سے اعزازات سے نوازا جاچکا ہے۔ دہلی اردو اکادمی نے بھی انھیں اپنے ایوارڈ سے سرفراز کیا تھا۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

حکومت کرناٹک اردو اسکولوں کے مسائل حل کرے گی

بنگلور (۲۹ جنوری)۔ ریاستی وزیر برائے ابتدائی و ثانوی تعلیمات رتنا کرنے آج یہ یقین دلایا کہ ریاست کی کانگریس حکومت اردو مدارس اور اقلیتی تعلیمی اداروں کے مسائل حل کرنے کی پابند ہے۔ وزیر اطلاعات آر۔ روشن بیگ کی تحریک پر اردو مدارس اور اقلیتی تعلیمی اداروں کے مسائل کی یکسوئی کے لیے طلب کردہ اقلیتی نمائندوں، اساتذہ، انجمنوں اور دانش وروں کے ہنگامی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ اردو مدارس بنیادی سہولیات سے محروم ہیں جہاں پر اساتذہ کا فقدان، کمرۂ اساتذہ کی کمی وغیرہ جیسے مسائل ہیں جنھیں حل کرنے کے لیے ان کی حکومت ہر ممکن کوشش کرے گی۔ وزیر موصوف نے بتایا کہ مرکز کے ذریعے اقلیتی تعلیمی اداروں کو فراہم ہونے والی امداد کو جاری کرنے میں لاپرواہی کے علاوہ اور کئی دوسرے مسائل ہیں، جنھیں حل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔ جناب روشن بیگ نے تجویز پیش کی کہ جہاں بھی اردو مدارس ہیں وہاں پر اردو آنگن واڑی قائم کیے جائیں تاکہ ہماری قوم کے نونہالوں کو فائدہ ہوسکے۔ بیگام کے رکن اسمبلی فیروز نورالدین سیٹھ نے اردو مدارس کے مسائل پیش کرتے ہوئے بتایا کہ گزشتہ سات برس سے بی جے پی دور حکومت میں سرکاری افسران کی ذہنیت تبدیل ہوگئی ہے اور وہ مخصوص فرقے کے ساتھ جانبدارانہ رویہ اختیار کررہے ہیں۔ ایسے میں حکومت کو چاہیے کہ ان افسران کی ذہنیت بدلنے کی پہل کرے۔ انھوں نے کئی ایک تجاویز پیش کرتے ہوئے بتایا کہ عربی مدارس کے لیے مرکز کے ذریعے منظور شدہ مناسب طریقے سے جاری نہیں کیا جارہا ہے اور کئی سالوں سے یہ با مقصد اسکیم افسران کی تنگ نظری کا شکار بنی ہوئی ہے۔ انھوں نے ڈراپ آوٹ کے مسئلے کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ پہلی تا ساتویں جماعت اردو مدارس میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد طلبہ ہائی اسکول نہ ہونے کے سبب ڈراپ آوٹ ہوجاتے ہیں۔ انھوں نے اقلیتی علاقوں میں تجربے کے طور پر ایسے کم از کم ۱۱ اسکول قائم کرنے کا مشورہ دیا جہاں پر دوسری زبان کے طور پر اردو سبجکٹ موجود ہو، تاکہ ہمارے بچے کنڑا کے ساتھ اردو پر بھی عبور حاصل کرسکیں۔ شانتی نگر کے رکن اسمبلی این اے حارث نے کہا کہ 17 ریاستوں میں مدرسہ بورڈ قائم ہے، اس لیے یہاں پر بھی جائزہ لے کر بورڈ قائم کرنے پر غور کیا جائے۔ تمام کانونٹ اسکولوں میں اردو کو ایک اختیاری مضمون بنایا جائے۔ میسور کے رکن اسمبلی تنویر سیٹھ نے بتایا کہ ریاست میں 5865 اردو اسکول ہیں جب کہ صرف 626 اردو ہائی اسکول موجود ہیں۔ انھوں نے مدرسہ بورڈ، سروشکشا ابھیان وغیرہ سے فراہم ہونے والی امداد کے صحیح استعمال نہ کرنے پر برہمی کا اظہار کیا۔ اس موقعے پر ریاست بھر سے آئے ہوئے اردو اساتذہ نے بھی اپنے اپنے مسائل پیش کیے اور گزشتہ سات برسوں سے اقلیتی اداروں کو منظم طریقے سے نظر انداز کیے جانے، نصابی کتابوں کی بروقت اشاعت، امدادی اسکولوں میں اساتذہ کے تقرر میں تاخیر، سچر کمیٹی سفارشات کے تحت پندرہ فیصد امداد کی فراہمی میں لاپرواہی، اردو اسکولوں میں فزیکل ٹیچرس کی قلت وغیرہ جیسے امور پر تبادلۂ خیال ہوا اور تقریب ہی اردو مدارس اور اقلیتی تعلیمی اداروں کے مسائل کا جائزہ لینے کے لیے ایک اجلاس طلب کرنے کا فیصلہ لیا گیا۔ اس موقعے پر منگلور کے رکن اسمبلی ڈاکٹر رفیق احمد، جاپور کے رکن اسمبلی ڈاکٹر مقبول باغبان، منگلور کے محی الدین باوا، محکمۂ اطلاعات کے کمشنر محمد محسن کے علاوہ اقلیتی تعلیمی اداروں کے ذمہ داران اور محکمۂ تعلیمات کے افسران موجود تھے۔

(سالار۔ بنگلور)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : اردو کی اہم خواتین افسانہ نگار
(صوبہ بہار کے حوالے سے)
مصنف : ڈاکٹر رخسانہ جمیل
ضخامت : ۱۸۳
قیمت : ۹۰ روپے
ناشر : ایم آر پبلی کیشنز، دہلی
تبصرہ نگار : امیر حمزہ
ameerhamsvab0336@gmail.com

اردو ادب کی مقبول ترین صنف افسانہ جو شروع ہی سے قارئین اور ناقدین کا مرکز رہا ہے اور یہ وہ صنف ہے جہاں مرد کے ساتھ خواتین بھی اس ادبی سفر میں شریک ہو جاتی ہیں۔ رشید جہاں سے لے کر تا حال خواتین افسانہ نگار شانہ بشانہ ساتھ رہتی ہیں۔ جہاں عصمت آپا اور عینی آپا کی ایک الگ دنیا نظر آتی ہے وہیں دور اول ہی سے بہار کی خواتین افسانہ نگار افسانے کی دنیا میں قدم رکھ چکی تھیں۔

بہار کی خواتین افسانہ نگار کی سپہ سالار شکیلہ اختر کے طور پر سامنے آتی ہیں، ان کا پہلا افسانہ ۱۹۳۹ء میں منظر عام پر آیا تھا جو ماہنامہ 'ادب لطیف' لاہور میں 'رحمت' کے عنوان سے شائع ہوا تھا جن کے نقش قدم پر چل کر ہندوستان کی کئی خواتین افسانہ نگاروں نے اپنا نام روشن کیا۔

زیر تبصرہ کتاب میں بقول ڈاکٹر کوثر مظہری "رخسانہ جمیل صاحبہ نے بڑی محنت و مشقت سے بہار کی خواتین افسانہ نگاروں کی تخلیقی نگارشات کا ایک ایسا جائزہ پیش کیا ہے جس سے ایک تحقیقی تناظر خلق ہو گیا ہے"۔ اس کتاب میں ان خواتین افسانہ نگاروں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو خطہ بہار سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان خواتین میں کئی کے نام ناموں کو بھی منظر عام پر لایا گیا ہے جو حقیقی معنوں میں خاتون افسانہ نگاروں کی تاریخ کو منظم کرنے میں ایک نئی پیش رفت ہے۔

اس کتاب کو مصنفہ نے چار گوشوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے گوشے کے شروع میں ایک مضمون شامل ہے جس میں بہار کی خواتین افسانہ نگار کے اردو افسانوں کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد اس گوشے میں انھوں نے 27 خواتین افسانہ نگاروں کے مجموعے اور افسانوں کا اجمالی جائزہ پیش کیا ہے۔ ان جائزوں میں انھوں نے ان کے اسالیب اور موضوع کو بیان کرنے میں خصوصی دل چسپی دکھائی ہے۔ 27 افسانہ نگاروں کے ذکر کے بعد آخر میں 17 خواتین افسانہ نگاروں کے اسما بغیر کسی تعارف اور تجزیے کے شمار کیے گئے ہیں، اس طرح یہ گوشہ ختم ہوتا ہے۔

دوسرے گوشے میں بہار کی خواتین کے اردو افسانے معیار کسوٹی کی تشکیل کے بعد سے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔ اس گوشے میں انھوں نے ذکیہ مشہدی، شمیم افزا قمر، رقیہ بیگم اور کچھ دیگر افسانہ نگاروں کو شامل کیا ہے۔

گوشہ سوم میں متعلق افسانہ نگاروں کے زبان و اسلوب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس میں انھوں نے سات خاتون افسانہ نگاروں کے زبان و اسلوب کا بہت اچھا جائزہ لیا ہے۔ آخر میں انھوں نے پوری کتاب کا ماحصل بھی پیش کیا ہے۔

کتاب کی طباعت عمدہ ہے اور سرورق بھی دیدہ زیب ہے۔ موضوع و طباعت کے تناسب سے قیمت صرف ۹۰ روپیہ بہت ہی مناسب ہے۔

●◆●

نام کتاب : ہندوستان کی جانباز خواتین
مصنف : ڈاکٹر بانو سرتاج
ضخامت : ۷۶ صفحات
قیمت : ۲۵۰ روپے
ناشر : موڈرن پبلشنگ ہاؤس
۹- گولا مارکیٹ، دریا گنج
نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲
تبصرہ نگار : دیپک بدکی
deepak.budki@gmail.com

اردو ادب کی معروف ادیبہ ڈاکٹر بانو سرتاج کی تازہ تحقیق 'ہندوستان کی جانباز خواتین' کا موضوع عام روش سے ہٹ کر ہے جو اردو زبان کے لیے ایک خوش آئند بات ہے۔ عام طور پر اردو میں ادب کی کتابیں تحریر ہوتی رہتی ہیں جب کہ جنرل نالج اور اسپورٹس کی جانب بہت کم قلم کار توجہ دیتے ہیں۔ مذکورہ کتاب میں ہندوستان کی ان خواتین کا مختصر تعارف دیا گیا ہے جنھوں نے مختلف میدانوں میں جیت کے پرچم لہرائے ہیں اور اپنے ملک کا نام بلند کیا ہے۔ ان خواتین میں ایک طرف کھیل کود سے جڑی خواتین ہیں، دوسری طرف کوہ پیما خواتین ہیں اور تیسری جانب خلا میں اڑنے والی خواتین ہیں۔ اتنا ہی نہیں کتاب کے اختتام پر نام، کھیل اور ریاست کے تعلق سے اشاریہ بھی دیا گیا ہے جس کے بعد تین ملحقات یا ضمیمہ جات دیے گئے ہیں جن میں ہندوستان کی ۵۱ اوّل خواتین، ۳۱ اوّل خواتین اور جنگ آزادی سے جڑی ۲۲ خواتین کی فہرستیں شامل ہے۔

ڈاکٹر بانو سرتاج پانڈھر کوڑ، ایوت محل مہاراشٹر میں ۲۸ جولائی کو پیدا ہوئیں، ایم اے (اردو، ہندی، تاریخ اور اصول تعلیم) کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور پھر معلمی سے وابستہ رہیں۔ اب تک ان کی ۲۵ سے زائد کتابیں منصہ شہود پر آ چکی ہیں۔

زیر نظر کتاب میں ڈاکٹر بانو سرتاج موڈرن خواتین کے بارے میں لکھتی ہیں کہ "وزن، بوجھ وہ پہلے بھی اٹھاتی تھیں (ممتا کا، خاندان کا، اپنی ذمہ داری کا)، آج وزن اٹھانے کے مقابلوں میں حصہ لے رہی ہیں۔ دوڑ وہ پہلے بھی لگاتی تھیں (شرارتی بچوں کو قابو میں کرنے کے لیے، بزرگوں کی خدمت کرنے وغیرہ میں) آج قومی اور بین الاقوامی ٹریک پر اپنی اور اپنے ملک کی شناخت قائم کرنے کے لیے دوڑتی ہیں۔ پہلے صرف خوابوں میں آسمانوں کی سیر کرتی تھیں آج نظام شمسی کے مختلف سیاروں پر قدم رکھ رہی ہیں۔" مصنفہ کا خیال ہے کہ ایسی خواتین نے ملکھا سنگھ کے اس بیان کو ("اولمپکس میں میڈل جیتنے کا جذبہ اور صلاحیت بھارتیہ اتھلیٹس میں نہیں ہے۔") جھٹلا دیا ہے اور "یہ ہے ووکن ایمپاورمنٹ (Women Empowerment) کی مثال جو ملک کے کھیل جگت کا نقشہ ہی بدل رہا ہے... آج خواتین کھیل کے میدان میں آگے آ کر اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے میں مردوں سے کسی طرح پیچھے نہیں ہیں۔"

مذکورہ کتاب میں جن خواتین کا ذکر کیا گیا ہے ان کے نام یوں ہیں: (۱) اتھلیٹکس مقابلہ - اشونی ناچپا (۲) بیڈمنٹن - سائنا نہوال (۳) باکسنگ - میری کام (۴) تیر اکی - بلا چودھری، آرتی ساہا، شکھا ٹنڈن، فریدہ رماں، ریچا مشرا (۵) تیر اندازی، نشانے بازی و شوٹنگ - دیپکا کماری، ڈولا بنرجی، بومیلا دیوی چیتھی رام، رچل بیدروفی، تیجسوتی سادنت، انجلی بھاگوت، راہی سرنوبت، ہینہ سدھو، چندر وتومر (۶) ٹیبل ٹینس - شیامنی باقو (۷) جوڈو - کرینا چودھری، سپتا شیلی (۸) چھلانگ - انجو بابی جارج (۹) خلا بازی - کلپنا چاؤلہ، سنیتا ولیمز (۱۰) دوڑ - پی ٹی اوشا، شائنی ولسن، جیوترمئی سکندر، سنیتا رانی، اشونی، سندھا سنگھ (۱۱) ڈسکس تھرو - کرشنا پونیا (۱۲) فضائیہ چھلانگ - سنگائی ڈائیونگ ریس جمپنگ - رشمی سنگھ، ارچنا سردانا (۱۳) سکواش - دیپکا پلی کل، جوشنا چناپا (۱۴) شطرنج - تانیا سچدیوا، کونیرو ہمپی (۱۵) کرکٹ - جھولن گوسوامی، متالی راج، انجم چوپڑا، ترش کامنی (۱۶) کشتی - الکا تومر، فاطمہ بانو، گیتا پھوگٹ (۱۷) کوہ پیمائی - بچھیندری پال، پریم لتا اگروال، رینا کوشل دھرم شکتو، سنتوش یادو، چیٹکا (۱۸) گیا سنگ، گیٹونگ - بچھیس میر (۱۹) گھوڑ دوڑ رہائی - سیما بندہ (۲۰) لان ٹینس - ثانیہ مرزا، جوالا گٹا، سانا بھامبری، پی وی سندھو (۲۱) ویٹ لفٹنگ - کرنم ملیشوری، کنجا رانی دیوی، رینو بالا چانو (۲۲) ہاکی - جیوتی گلو (۲۳) ہائی جمپ - سہانا کماری۔

مندرجہ بالا خاکوں میں مصنفہ نے مذکورہ خواتین کی حیات کے سرد و گرم واقعات، ان کے کمالات اور حاصل کیے گئے انعامات و اعزازات کو مختصر طور پر بیان کیا ہے جو سمندر کو کوزے میں بند کرنے کے برابر ہے۔ یہاں ایک سہو کی جانب اشارہ کرنا ضروری ہے۔ Grand Prix کو اردو میں 'گراں پری' لکھنا چاہیے جو اس کا صحیح تلفظ ہے۔ لگتا ہے بانو سرتاج کے تانیثی جذبے نے انھیں یہ کتاب لکھنے پر آمادہ کیا ہے اور یہ حق بجانب بھی ہے۔ ان کی یہ کاوش اردو زبان کے لیے گراں قدر کام ہے جو نہ صرف عام قارئین کے لیے مفید ثابت ہوگی بلکہ اس کی حوالہ جاتی حیثیت بھی مسلّم ہے خاص کر ان قارئین کے لیے جنھیں ہندوستانی خواتین کی کارکردگی یا پھر اسپورٹس وغیرہ سے دل چسپی ہے۔ امید کرتا ہوں کہ اس کتاب کی خوب پذیرائی ہوگی۔ ●●

بقیہ: شمالی آرکاٹ کے شعر و ادب...

صفحہ ۳ سے آگے

انیسویں صدی کے اواخر تک بھی تمل ناڈو میں اردو کے مراکز شہر ویلور اور ترچناپلی ہی تھے لیکن انیسویں صدی ختم ہوتے ہوتے اردو ادب کے قدم شمالی آرکاٹ میں آمبور، وانمباڑی، ترپاتور، ویلور، پلی کنڈہ، گڈیاتم، وشارم اور پرنامبٹ جیسے مقامات تک بھی پہنچ گئے تھے۔ چناں چہ ان مقامات پر مولانا امانی ہنگنڈوی، مولانا نسیم آمبوری، علامہ شاکر نائطی، شاکر وانمباڑی، بادشاہ وانمباڑی، حکیم آسی ترپاتوری، دانش فرازی، مولانا اسماعیل رشکی، ابوالبیان حماد، حافظ رانچوئی، سالک نائطی، تنظیم افسر پاشاہ، فدوی باقوی، فیضی صدیقی، عبدالقادر نویدی، اشرف سعودی، بدر جمالی، یعقوب اسلم، کاظم نائطی، سہیل راشد، جلال عرفان اور راہی فدائی کے نام ملتے ہیں جن کی علمی و ادبی کاوشوں نے ان شہروں کی زمین کو ادب و شعر کے لیے زرخیز بنا دیا۔ ان حضرات میں صرف اچھے شاعر ہی نہیں بلند پایہ ادیب، محقق اور نقاد بھی ہیں۔ ان میں بعض شاعروں نے اپنے اساتذہ کے آگے زانوے ادب بھی تہ کیا تھا۔ ان حضرات کے فیض سے یہ سارے شہر شعر و ادب کے گہوارے بن گئے اور ان مقامات پر ایک ایسا شعری و ادبی ماحول بن گیا جس کی خوشبوؤں سے آج بھی قوس و قزح کی کرنیں پھوٹتی ہیں۔

بہ حیثیت مجموعی شمالی آرکاٹ میں اردو ادب کی نہ صرف نشوونما ہوئی بلکہ اس نے ارتقائی سفر بھی طے کیا ہے اور اپنے روشن کارناموں سے یہ علاقہ اردو ادب کی تاریخ میں ایک الگ اور نمایاں مقام رکھتا ہے۔

●◆●

بقیہ: صحافی جو شراب کے ہاتھوں...

صفحہ ۸ سے آگے

روح کا رشتہ ختم ہوگیا۔ ان کا نام اس وجہ سے زندہ ہے کہ ان کی دو کتابیں 'خونیں تحریکیں' اور 'دُنیائے اسلام کا ماضی و مستقبل' بڑی مقبول ہوئی تھیں جنھیں مکتبہ عالمگیر نے شائع کیا تھا۔ ان سے ظاہر تھا کہ مختلف تحریکوں اور اسلام کی تاریخ پر ان کی گرفت کتنی مضبوط تھی۔

تقسیم ملک کے بعد جب میاں افتخار الدین نے لاہور سے اردو روزنامہ 'امروز' جاری کیا تو فیض احمد فیض، چراغ حسن حسرت، محمد سرور اور ایوب کرمانی اس کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں شامل تھے۔ ادارت نوبت محمد سرور کے ہاتھ میں آئی۔ انھیں اپنی سیاسی ذہانت پر ناز تھا اور کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ چراغ حسن حسرت کو اپنی زبان دانی پر فخر تھا اور اپنی ادیبی عزیز تھی، وہ ہمیشہ محمد سرور کو یہ جتاتے کہ میں تم سے سینئر ہوں لیکن سرور ان کی بات پر دھیان نہ دیتے۔ حسرت نے جب بار بار اپنی برتری کا احساس دلایا تو تنگ آکر وہ ملازمت سے مستعفی ہوگئے اور کراچی چلے گئے جہاں انھیں سندھ حکومت میں ڈائرکٹر اطلاعات عامہ کی نوکری مل گئی۔ وہ بلا کے مے نوش تھے اور خون کے ساتھ ساتھ شراب بھی اُن کی رگوں میں دوڑتی تھی، بلا ناغہ پیتے اور نشے میں دھت ہوجاتے۔ بعض اوقات اتنا نشہ چڑھ جاتا کہ اول فول بولنے لگتے اور آس پاس بیٹھے لوگ ہنسنے لگتے۔ دوستوں نے بہت سمجھایا کہ اعلا ملازمت میں ہو اور اتنا اچھا کیریئر بن رہا ہے، سنبھل کر پیا کرو مگر وہ شراب ہی کا ہو کے رہ گئے تھے۔ ایک روز زیادہ پی کر ہوٹل کی چھت پر چڑھ گئے، ترنگ میں آکر چھلانگ لگادی اور خدا کو پیارے ہوگئے۔ کسی نے کہا پاؤں پھسل گیا تھا اور کوئی بولا کہ خودکشی کرلی لیکن خودکشی کی وجہ سمجھ سے باہر تھی۔

قاضی احسان اللہ کسی زمانے میں اخبار 'زمیندار' کے مدیر اعلا ہوا کرتے تھے۔ پڑھے لکھے تھے، زبان پر مہارت حاصل تھی اور خوب لکھتے تھے۔ شراب نوشی کا یہ عالم تھا کہ دن رات پیتے۔ دین دار مسلمان کی طرح روزے رکھتے مگر نشے کے ہاتھوں مجبور تھے۔ دوست اور رفقا حیرت زدہ ہوجاتے مگر کوئی کچھ کہنے کی جرأت نہیں رکھتا تھا کیوں کہ ان کے علم و فضل کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ آخرکار اس انگور کی بیٹی کے ہاتھوں قبر کی آغوش میں چلے گئے۔

قاضی احسان اللہ کی زندگی کا ایک دل چسپ واقعہ یہ ہے کہ ایک بار جب اخبار 'زمیندار' کی ضمانت ضبط ہوئی اور یہ غیر معین عرصے کے لیے بند ہوگیا تو اس کے کارکنوں میں ہراس پھیل گیا، روٹی روزی کا مسئلہ پیدا ہوگیا۔ اخبار کے دو اداری کارکنوں یعنی احسان اللہ اور منظور ہاشمی نے قوت لایموت کی خاطر لاہور کے ایک خیاط جلال الدین کو بلی کا بکرا بنایا جو شہرت کا بھوکا تھا۔ اُسے جنرل منیجر بناکر خود روزنامہ 'نیرنگ' کے ایڈیٹر بن بیٹھے۔ پہلا پرچہ شائع ہوا تو دونوں ایڈیٹر اور جنرل منیجر ڈاکٹر اقبال کے پاس گئے، اخبار ان کے ہاتھوں میں تھمایا اور دعائے خیر کے طالب ہوئے۔ تھوڑی گفتگو کے بعد جلال الدین درزی نے اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "ڈاکٹر صاحب آپ کی حذاقت کی بڑی شہرت سنی ہے، میری صحت ٹھیک نہیں رہتی، ذرا نبض دیکھ کر بتایئے کہ مجھے کیا بیماری ہے؟" ڈاکٹر اقبال زیر لب مسکرادیے اور دونوں ایڈیٹر صاحبان کو بڑی شرمندگی اٹھانی پڑی۔

سید حبیب کے اخبار 'سیاست' کا شمار لاہور کے مشہور اخبارات میں کیا جاتا تھا۔ اس کی تکاتکی روزنامہ 'زمیندار' سے ہمیشہ رہتی تھی۔ آئے دن مولانا ظفر علی خاں سے جھڑپیں ہوتی تھیں اور انھیں جی بھر کے کوسا جاتا تھا۔ مولانا بھی پھکّے بازی میں ماہر تھے اور اپنے اخبار میں منہ توڑ جواب دیتے تھے، زندہ دل قارئین اپنی دل جوئی کی خاطر دونوں اخبارات پڑھا کرتے تھے۔ جب بھی دونوں پرچوں میں تابڑتوڑ حملے شروع ہوتے تھے تو اخباری حلقوں میں رونق پیدا ہوجایا کرتی تھی اور زندہ دلانِ پنجاب اور نیازمندانِ لاہور کے چہرے کھِل اٹھتے تھے۔ جھڑپیں نظم اور نثر دونوں میں ہوا کرتی تھیں۔ 'سیاست' میں انگریز سرکار کو بھی خوب لتاڑا جاتا تھا اور سید حبیب ہمیشہ پنجاب کے گورنر کو کسی نہ کسی بہانے زیر عتاب رکھتے تھے۔ گورنر نے بالآخر تنگ آکر اس اخبار کا ڈیکلریشن منسوخ کردیا تھا۔

سید حبیب کی سیاسی مصروفیات بہت زیادہ تھیں۔ ان کے خلاف عدالتوں میں سیاسی مقدمات ہمیشہ چلتے رہتے تھے۔ ایک بار انھوں نے 'سیاست' کی ادارت خان محمد اسحاق خاں ملیک کے سپرد کردی جو ایک کہنہ مشق جرنلسٹ تھے اور صحافت کی دنیا میں ان کا بڑا نام تھا مگر ان کی حالت یہ تھی کہ جام جم ہر وقت ہاتھ میں رکھتے تھے۔ دفتر میں پہنچتے اور لیڈنگ آرٹیکل لکھنا شروع کرتے تو صراحی اور پیالہ سامنے میز پر موجود ہوتے۔ سید حبیب پاک باز انسان تھے، انھیں دختر عناب سے سخت نفرت تھی، وہ اپنی تقاریر میں نشہ بندی کا مطالبہ بھی کیا کرتے تھے۔ انھیں یہ سب ناگوار گزرتا تھا مگر کیا کرتے مجبور تھے، کوئی اور اچھا ایڈیٹر اس وقت دستیاب نہیں تھا۔

پنجاب کے سرکردہ لیڈر شیخ محمد عالم نے انڈین نیشنل کانگریس سے الگ ہوکر مسلم نیشنلسٹ کانفرنس قائم کی۔ شاندار پیمانے پر لاہور میں اس کا پہلا اجلاس بلایا اور صدارت کے لیے ڈاکٹر مختار احمد انصاری کو دلی سے بلایا گیا۔ جب ڈاکٹر انصاری لاہور پہنچے تو دوقومی نظریے کے حامی مسلمانوں نے ان کے خلاف سیاہ جھنڈیاں ہاتھ میں لے کر مظاہرہ کیا۔ خان محمد اسحاق خان کو نہ جانے کیا سوجھی کہ ہاتھ میں شراب کی بوتل لے کر مہمان رہنما کے خلاف نعرے لگانے لگے۔ وہ زور زور سے کہہ رہے تھے کہ "میں شراب اس لیے پیتا ہوں کہ مہاتما گاندھی شراب پینے سے منع کرتا ہے اور ہاں یہ کانگریسیوں نے شراب کے ٹھیکوں پر پکٹنگ کیوں لگا رکھی ہے، شراب پینے کا حق ہر ایک کو حاصل ہے پھر اس پر پابندی کا مطالبہ کیوں؟" ڈاکٹر انصاری شرافت کی تصویر بنے یہ سب تماشا دیکھ رہے تھے اور لاہور کے شریف شہری شرمندہ ہو رہے تھے۔ آخر ایک روز محمد اسحاق خاں بھی شراب کے ہاتھوں مارے گئے۔

•••

انجمن ترقی اردو (ہند) کی چند مطبوعات

ترقی پسند ادب	علی سردار جعفری	۳۰۰/=
دلّی کی درگاہ شاہ مرداں	خلیق انجم	۲۰۰/=
چہار ورق (سرسیّد سے پہلے اردو ادب کے منتخب ادارے) اسلم پرویز انتخاب و ترتیب	شمس الحق عثمانی، محمد فیروز دہلوی	۳۰۰/=
راس مسعود	حکیم سید ظل الرحمن	۲۵۰/=
پھلواری	اطہر فاروقی	۲۲۰/=
سیرت فریدیہ (سرسیّد کے نانا خواجہ فریدالدین احمد خاں اور دیگر افرادِ خاندان کے حالات) مصنف: سرسیّد احمد خاں، مرتب:	خلیق انجم	۱۵۰/=
ہندستان میں اردو سیاست کی تقسیم نو	اطہر فاروقی	۲۶۰/=
انقلاب ایک تاریخ، ایک تہذیب کی کہانی	عبداللہ غازی	۸۵/=
پلیٹینل (ماحولیاتی آلودگی پرمشتمل ڈرامہ)	ڈاکٹر مظفرالدین فاروقی	۱۲۰/=
دوکان شیشہ گراں (کتابیں اور لوگ)	شمیم حنفی	۴۰۰/=
دلی کے محاورے	سید ضمیر حسن دہلوی	۱۰۰/=
مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا	خلیق انجم	۲۳۰/=
غالب تنقید	جاوید رحمانی	۱۱۰/=
سن ستاون کی دلّی اور بہادر شاہ ظفر	اسلم پرویز	۱۵۰/=
آزاد ہندستان میں اردو زبان تعلیم اور صحافت	اطہر فاروقی	۱۶۰/=
ہندستان میں فکری و تہذیبی اصلاح کا آغاز اور ماسٹر رام چندر	صدیق الرحمن قدوائی	۱۸۰/=
The Court of Indar / اندر سبھا (سید آغا حسن امانت)	افروز تاج	۳۰۰/=
اردو ہے جس کا نام (رباعیات کا مجموعہ)	امیر چند بہار	۱۱۰/=
پریم چند گھر میں (شِورانی دیوی)	مترجم: سید حسن منظر	۳۰۰/=
ادب کی سماجیات: تصور اور تعبیر (منیجر پانڈے)	مترجم: سرورالہدیٰ	۲۰۰/=
دلی کے مسلمان دانشور (انیسویں صدی) مصنف: مشیر الحسن	مترجم: مسعودالحق	۲۷۵/=
گفتگو ان کی	اطہر فاروقی	۱۵۰/=
جہان اقبال	عبدالرحیم خاں	۷۵/=
کرشن چندر کے ناولوں کا تنقیدی مطالعہ (سیاسی اور سماجی پس منظر میں)	ڈاکٹر عبدالسلام صدیقی	۸۵/=
ہم سفروں کے درمیان	شمیم حنفی	۱۵۰/=
ڈاکٹر بشیر بدر کی شاعری (دیدہ گری)	ڈاکٹر انجم بارہ بنکوی	۶۰/=
محقق غالب کالی داس گپتا رضا	محمد عارف خاں، ثاقب صدیقی	۸۰/=
ہوری رکیس	ڈاکٹر قمر رئیس	۸۵/=
خواجہ غلام السیدین	پروفیسر آل احمد سرور	۲۲۰/=
خواجہ غلام السیدین (مضامین اور تقریریں)	خلیق انجم	۱۰۰/=
اقبال یورپ میں	ڈاکٹر سعید اختر درانی	۲۵۰/=
دیوان بیان (احسن اللہ خاں بیان)	ارجمند آرا	۱۵۰/=
نوادرِ اقبال یورپ میں	ڈاکٹر سعید اختر درانی	۱۴۰/=
بھگود گیتا (اردو منظوم)	شان الحق حقی	۷۰/=
جگنوؤں کی دنیا	قرۃ العین حیدر	۶۰/=
انتخاب جدید (۱۹۱۴ء تا ۱۹۴۲ء)	آل احمد سرور، عزیز احمد	۱۴۰/=
مصطلحات ٹھگی (علی اکبر الہ آبادی)	رشید حسن خاں	۱۲۰/=
انتخاب عزیز لکھنوی	خلیق انجم	۳۰/=
انتخاب فراق گورکھپوری	انجمن ترقی اردو (ہند)	۳۰/=

ماضی کی المناک یادیں

صحافی جو شراب کے ہاتھوں مارے گئے

وشوا ناتھ طاؤس (C-38، سیکٹر 39، نوئیڈا 201303)

اطہر امرتسری اڈیٹر روزنامہ 'زمیندار'	محمد سرور اڈیٹر روزنامہ 'امروز'
قاضی احسان اللہ اڈیٹر روزنامہ 'نیرنگ'	خان محمد اسحاق خاں اڈیٹر روزنامہ 'سیاست'

شراب کو ام الخبائث قرار دیا گیا ہے۔ کتنے ہی ادیب اور شاعر کثرت مے نوشی کے باعث قبل از وقت موت کے منہ کا نوالہ بن گئے۔ اختر شیرانی، عبدالحمید عدم، سعادت حسن منٹو، مجاز لکھنوی، ترلوک کمار شاد، سرشار سیلانی، سلام مچھلی شہری، پریم وار برٹنی، ستیہ پال اختر رضوانی اور نہ جانے کتنے ادبا و شعرا اس کا شکار ہوکر دنیا سے منہ موڑ گئے۔ شعرائے کرام کی شراب نوشی کا جواز یہ پیش کیا جاتا ہے کہ وہ تخیل کی اڑان بھرتے ہیں اور اس اڑان کا سہارا لینے کے لیے انھیں نشہ درکار ہے ورنہ وہ دھڑام سے فرش پر گر پڑیں اور ان کے شعر کا تانا بانا بکھر جائے۔ ادیبوں کے لیے دلیل پیش کی جاتی ہے کہ وہ تصوراتی محل تعمیر کرتے ہیں اور اسے آراستہ و پیراستہ کرنے کے لیے انھیں جام و مینا سے تحریک ملتی ہے، غرض کہ ہر ادیب اور شاعر حسن بن صباح کی طرح نقلی جنت کی تکمیل میں مصروف عمل رہتا ہے۔ وہ حق تعالیٰ کی بخشی ہوئی فطری صلاحیتوں کو بروئے کار نہیں لاتے بلکہ مصنوعی نشوں میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ صحافت دنیا کا افضل ترین پیشہ ہے۔ خالق ازل نے صحافی کو دنیا کا خبر گیر ہونے کا منصب بخشا ہے۔ اس کے مقدر میں راحت نہیں، وہ شب و روز اپنے فرائض کی ادائیگی میں بندھا رہتا ہے اور دنیا بھر کے حالات سے نہ صرف خود باخبر رہتا ہے بلکہ اہل جہاں کو خبردار کرتا ہے۔ رات کو جب لوگ چین کی نیند سوتے ہیں وہ اخبارات کے دفاتر میں جاگ کر قلم و قرطاس سے رشتۂ الفت استوار کرتا ہے۔ اس کے سامنے ایک مشن ہوتا ہے جسے تکمیل تک پہنچانے کے لیے اسے پل صراط سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس تگ و دو میں بعض اوقات جان سے بھی ہاتھ دھونے پڑتے ہیں۔

ایک دور تھا جب اخبار نویسی عالم وفاضل شخصیتوں کا مقدس Profession تھا، جب اردو ادب اور سیاست کا مرکب ہوتا تھا۔ وہ اپنا گھر پھونک کر خود تماشا دیکھتا تھا اور دنیا کو دکھاتا تھا۔ متقدمین میں لالہ دینا ناتھ حافظ آبادی، مولانا ظفر علی خاں، مولانا محمد علی جوہر، مہاشہ کرشن، جناب خوشحال چند، مولانا حسرت موہانی، خواجہ حسن نظامی، حضرت غلام رسول مہر، جناب عبدالمجید سالک، آغا شورش کاشمیری اور مولانا مرتضیٰ احمد میکش سب صوفی منش تھے اور شراب انھیں چھو تک نہیں گئی تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد صحیفہ نگار سے کہیں بڑے انشا پرداز تھے، وہ ایسے عالم تھے، جہاں پر آکر دنیا میں علم کی حدود ختم ہوجاتی ہیں وہاں سے مولانا آزاد کا علم شروع ہوتا تھا۔ سردار دیوان سنگھ مفتون موسم سرما میں ٹھنڈ سے محفوظ رہنے کے لیے کبھی کبھی ایک آدھ پیگ برانڈی کا لے لیا کرتے تھے، وہ عادی شراب نوش نہیں تھے۔

انگریزوں کی غلامی کے باعث مغربی تہذیب کو فروغ حاصل ہوا تو مے کشی کی بدعت ہندستانی اخبار نویسوں کی رگوں میں بھی سرایت کرگئی اور وہ اپنی پاکیزگی کھو بیٹھے، وہ انگریز حکمرانوں کے Bar Room میں جانے لگے۔ کچھ بالا خانوں کے زینے طے کرنے لگے جو Afford نہیں کرسکتے تھے انھیں بھی شوق چرایا، چنانچہ ایک نے ناجائز شراب کے اڈوں کو مسکن بنالیا، کچھ نے مے ارغوانی کی بوتلیں ہاتھ میں تھام لیں اور پی کر سرعام بازاروں میں بھٹکنے لگے اور کئی نے گھروں میں راگ رنگ کی محفلیں سجا کر خانگی زندگی میں آگ لگالی، یہ سب اسی ام الخبائث کے باعث ہوا۔ آیئے آپ کے سامنے ان صحافیوں کا کچا چٹھا بیان کروں جنھوں نے اپنا مستقبل خود تباہ کرلیا اور جنھیں غیر طبعی موت نصیب ہوئی۔

مشہور اخبار نویس اطہر امرتسری راولپنڈی کے رہنے والے تھے جہاں ان کے والد گرامی گھوڑوں کی زینیں تیار کرنے کا کاروبار کرتے تھے۔ اطہر اردو فارسی بخوبی جانتے تھے اور عربی سے بھی آشنا تھے۔ زمیندار، احسان، انقلاب وغیرہ اخبارات میں ان کا کلام چھپا کرتا تھا، مجلس احرار کے سرگرم کارکن تھے اور اس کی راولپنڈی شاخ کے ناظم تھے۔ احراریوں نے شہید گنج تحریک سے بے اعتنائی برتی تو اس سے الگ ہوگئے اور احرار کے خلاف مورچہ لگا دیا۔ مولانا ظفر علی خاں نے ان کی تعلیم اور ذہنی صلاحیتوں کو دیکھ کر انھیں اپنے اخبار 'زمیندار' میں بلا لیا۔ کچھ سالوں بعد جب ملک نصر اللہ خاں عزیز 'زمیندار' سے علاحدہ ہوگئے تو ظفر علی خاں نے ادارت کی دستار فضیلت اطہر امرتسری کے سر پر رکھ دی اور پھر وہ اس ممتاز اخبار کے آخری دور تک اس کے مدیر رہے۔ انھیں معقول تنخواہ ملتی تھی، علاوہ ازیں وہ روزانہ ظفر علی خاں اور ان کے اکلوتے فرزند ارجمند اختر علی خاں کے موڈ کو دیکھ کر افتتاحیہ اور شذرات تحریر کرتے تھے اس لیے انعام و اکرام سے بھی فیض یاب ہوتے تھے۔ گھر بسایا نہیں، بس جورو نہ جاتا اللہ میاں سے ناطہ، آہستہ آہستہ خراب عادتوں میں پڑگئے اور شراب نوشی کی لت پڑگئی۔ تنخواہ کا بڑا حصہ اسی پر خرچ کردیتے، تھوڑا ملتا تو اسپرٹ ہی پی لیتے، لنڈے بازار سے نقلی شراب بیچنے والوں کے اڈوں سے بوتل خریدتے اور کھڑے کھڑے بغیر پانی یا سوڈے کے غٹاغٹ پی جاتے۔

زیادہ پی کر آدمی بہک جاتا ہے بہکتا، لڑکھڑانے لگتے اور بجلی کے کھمبوں سے پیار محبت کی باتیں کرنے لگتے، خود بولتے اور خود ہی جواب دینے لگتے۔ کھمبے سے کہتے "اب آگے سے ہٹ جاؤ، راستہ دو، مجھے آگے جانا ہے۔ جلدی میں ہوں"۔ کھمبا ہٹتا نہیں تھا نہ راستہ چھوڑتا تھا لہٰذا بے دھڑک آگے بڑھتے اور ماتھا کھمبے سے ٹکرا کر پھوٹ جاتا۔ اسی لنڈے بازار میں کسی غیر ڈگری یافتہ یا سابقہ کمپاؤنڈر ڈاکٹر کا بورڈ لگا کر بیٹھے تھے، ان کے پاس جاکر مرہم پٹی کراتے اور چونی ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہتے "بس اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں"۔

اطہر امرتسری کی عادات عجیب و غریب تھیں، کئی کئی روز تک غسل نہیں کرتے تھے، کپڑے میلے کچیلے ہوتے تھے، دن بھر ہاتھ نہیں دھوتے تھے اور کٹوری میں میلی کچیلی انگلیاں ڈال کر پورا سالن کھا جاتے تھے۔ ادارت کی کرسی پر فاتح اعظم سکندر بن کر بیٹھتے اور ماتحت عملے پر حکم چلاتے، ڈیوٹی ادا کرنے کے بعد کرسی سے اترتے تو سب کے ساتھ گھل مل جاتے۔ مالکان اس لیے ان سے خوش تھے کہ وہ ایک فرماں بردار ملازم کی طرح کام کرتے تھے اور ہمیشہ ان کی مرضی اور پالیسی کے تابع رہتے تھے۔ اختلاف رائے کی نوبت کبھی نہیں آئی تھی۔

مولانا ظفر علی خاں کا انتقال ہوا تو اطہر کو بڑا صدمہ پہنچا، آخر بیس سال تک ان کا نمک کھایا تھا۔ اختر علی خاں میں باپ جیسی خوبیاں نہیں تھیں، وہ سنبھل نہ سکے اور بے حوصلہ ہوگئے۔ اطہر کی رحلت بڑے دردناک حالات میں ہوئی۔ وہ اچھی اور سستی شراب سے بے نیاز تھے، ٹھرا اور اسپرٹ پی پی کر انھوں نے صحت برباد کرلی تھی اور ان کی ایک آنکھ کی بینائی زائل ہوچکی تھی۔ اپنے مالک کی موت کے بعد اور زیادہ پینے لگے کیوں کہ اب روکنے ٹوکنے والا اور کوئی نہیں تھا۔ جس لڑکے کو گھر میں ڈال رکھا تھا وہ بڑا ہوچکا تھا، اسے حرام خوری کی عادت پڑچکی تھی۔ روزی روٹی پیدا کرنے کے قابل تھا، گھر کے برتن تک بیچ کر کھا جاتا تھا۔ ہر طرف سے دل برداشتہ ہوکر ایک رات اطہر نے اتنی پی کہ جسم اور

(بقیہ صفحہ ۶ پر)

مدیر: اطہر فاروقی
شریک مدیر: محمد عارف خاں
پرنٹر پبلشر: شاہد خاں — مطبوعہ: ثمر آفسیٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، ۲۱۲-راؤز ایونیو، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲
قیمت (فی شمارہ) دو روپے، سالانہ: ۸۵ روپے (بیرونی ممالک آٹھ امریکی ڈالر)
Phones: 23237212, 23237214
E-mail: hamarizaban@atuh.org
http://www.atuh.org